نثری مجموعہ

چاندرس گاہ داب



پرویز مانوس

اپنے سب سے پیارے دوست
سلیم سالک کی نذر محبت
کے ساتھ
برائے تاثرات

[signature]

۱۰ ستمبر ۲۰۰۵

شعری مجموعہ

چاند، لمس، گلاب

پرویز مانوس

درخشاں پبلیکیشنز سنٹر نزد آل انڈیا ریڈیو پونچھ جموں کشمیر

نام کِتاب	-----	چاند، لمس، گلاب
مُصنِف	-----	پرویز مانوس
صفحات	-----	۱۶۰
سَن اشاعت	-----	جُولائی ۲۰۰۸ء
قیمت	-----	۳۰۰ روپئے
کمپوزنگ	-----	جمیل خان
ترتیب	-----	درخشاں پرویز
سرورق	-----	نذیر احمد وانٹ
طِباعت	-----	Quaf Printers Sgr.
تعداد	-----	ایک ہزار

ملنے کا پتہ

۱۱۵ آزاد بستی ویسٹ نٹی پورہ سرینگر ۱۹۰۰۱۵

انتساب

مَحمودہ کے نام جس کے لمس کی خُوشبُو

تا قیامت میری سانسوں کو مہکاتی رہے گی



ہزاروں نے مُجھے چاہا
مگر میں نے کسی کو آج تک
چاہا نہیں تیرے سوا جاناں
نہ جانے کون سی تاثیر ہے
اِن تیری آنکھوں میں
کہ میلوں سے جو مُجھ کو کھینچ لاتی ہے
تیری جانب
تُمہارے لمس کی خُوشبُو
تمہارے لمس کی خُوشبُو



ابتدائیہ

۵۔ ہر عصر اپنا ایک الگ استعارہ رکھتا ہے۔ اِسکے مشارہ‘‘ اِلیہ تک پہنچنے کے لئے اُس عصر کا تخلیقی سرمایہ بہت حد تک ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ متن کے اندر چھپے ہوئے تہہ در تہہ جہانِ معٰنی کا حصول دراصل اُس عصر کی قدروں، Cultural Values ثقافتی میلانات اور فرد سے فرد کے رشتے کی یافت ہوتی ہے۔ ان مثبت پہلوؤں کی یافت دراصل اُس اِستعارے کی یافت کے ساتھ ایک پورے عصر کی یافت ہے۔ تخلیق کار کوئی ڈٹھ بند نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کو ماقبل وسیع و عریض زمانوں سے ہم آمیز کر کے اُنکو گنتیا میں لاتا ہے۔ ایک حساس تخلیق کار ردے پر ردا نہیں چڑھاتا ہے بلکہ صحیح معنوں میں اُس عصری استعارے کا شعور و عرفان رکھنے کے ساتھ تکلف، تقع اور اِغلاق سے دامن کشی بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس رمز کو پانے والا صحیح معنوں میں عصری استعارے کا ترجمان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری ۔۔۔داغ

پرویز مانوسؔ کا تعلق اردو کی جدید تر نسل سے ہے۔ وہ غزل نظم کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُنکی غزلوں میں بے ساختہ پن، موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ جدید و قدیم کا خوبصورت امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ نظموں میں فنی در و بست بھی ہے اور ارتکاز بھی۔

جب ہم معاصر غزل پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں یکسانیت، یک رخہ پن اور نسانیت حاوی رجحانات نظر آتے ہیں جسطرح ایک زمانے میں لکھنوی غزل پر نسانیت، تکلف اور تقّع حاوی رجحان تھا اور جسکے خلاف یگانہ چنگیزی کو صدائے احتجاج بلند کرنا پڑی وہی لکھنویت بہ الفاظ دیگر وہی ناسخیت آج پورے غزلیہ سرمایہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ جس نے غزل کے تخلیقی امکانات کو بہت حد تک نشان زد کر دیا ہے۔

داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں
نہیں مقدور کہ میں چھین لوں تخت طاؤس

چور آیا گیا بھی خالی ہاتھ
میں تو اپنے مکاں میں تھا ہی نہیں

غزل کو بانکپن اور تخلیقی امکانات بحال کرنے کے لئے ہمیں سوداؔ، آتشؔ، اقبالؔ، یگانہؔ اور یاسؔ کے پاس مراجعت کرنی پڑے گی ورنہ اس بیوہ کے عشق میں غزل کا تخلیقی سرمایہ رنڈوا ہو جائے گا۔ جب اس تناظر میں ہم پرویز مانوسؔ کی غزل کو دیکھتے ہیں تو سادگی، اصلیت اور جوش کے ساتھ ایک قاری بانکپن سے بھی ہم رشتہ ہو جاتا ہے۔ یہ اُنکی انفرادیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ان باتوں سے اُنکے تخلیقی شعور اور تخلیقی امکانات کا پتہ چلتا ہے۔

یزید و کاٹ لو سر جتنے چاہو اِس گھڑی تم! پھر
کسی بھی شہر کو میں کربلا ہونے نہیں دوں گا

گھر جلانے جارہا ہوں اپنا میں

شہروالوں گل کرو سب بتیاں

لاشیں بچھی ہیں راہ میں پر، قوم کا رہبر

تاجر کی طرح سود و زیاں دیکھ رہا ہے

پرویز مانوس ایک باشعور اور متجس ذہنیت کے مالک ہیں۔ اُنہوں نے زندگی کے روز و شب کو بے نیازی کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا ہے۔ اُنکی شاعری اِس تلاش تجس اور شعور کا خلاقانہ اظہار ہے۔ انکی لفظیات اور آہنگ میں نیا پن ہے مگر اُن کا جمالیاتی ذائقہ، تاثر اور اُن سے خلق ہونے والا ذہنی، جذباتی معمولات نئے ہیں۔

پرویز مانوس کے یہاں خالی اُکتاہٹ نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اُنکے یہاں زندگی اور مظاہر کائنات سے اُس پر استوار رشتہ کا اظہار جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ جو ایک زندہ اور متحرک انسان کو زیست کرنے پر اُکساتا ہے۔ اِسی وجہ سے اُنکی شاعری میں نشاط پہلو جا گزیں ہوا ہے۔ بلکہ تخلیقی شعور اور نظم و ضبط اُنیں کہیں بھی اپنے جائے سے باہر ہونے نہیں دیتا ہے۔

وہ سویٹر اور مفلراب پرانے ہو گئے

پھر کوئی تازہ نشانی بھیج دو کشمیر سے

اُس نے بھیجا ہے مجھے لکھ کے یہی پیپل پر

اِسی پتے کی طرح تو بھی بکھر جائے گا۔

پرویز مانوس کی شاعری کی بڑی خصوصیت جس سے کسی بھی وقت صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ہے وہ ترنم ریزی اور مصرعوں کی سلاست ہے اُسکی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ اُنہوں نے نا مانوس اور غیر مطبوعہ اوزان سے بہت حد تک احتراز کیا ہے اور اُن ہی اوزان کو اپنے تخلیقی اظہار کے لئے استعمال کیا ہے جو اُردو شاعری میں زیادہ مترنم اور خوش آہنگ مانے جاتے ہیں۔ مثلاً بہر رمل۔ ہزج اور اُنکے مزاحف اوزان دوسرے یہ کہ اُنہوں نے سبک ، سادہ اور روزمرہ سے زیادہ سے زیادہ کام لیا ہے۔ اِسی وجہ سے اُنکی شاعری سہل ممتنع کی حدوں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اُن کا یہ مجموعہ قاری کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرے گا۔

ڈاکٹر فرید پربتی
شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی
سرینگر

حمد

خُدایا حسیں ہے حسیں تری دُنیا
بنائے سے بنتی نہیں تری دُنیا

زمینُوں کا اور آسمانوں کا مالک
خُدایا ہے تو کُل جہانوں کا مالک

ہے میٹھے سُروں میں تیری ہی روانی
تِرا وِرد کرتا ہے دریا کا پانی

تیرا ذِکر ہر لب پہ ہر انجمن میں
تِری نغمگی طائرانِ چمن میں

تیرا جلوہ ہر صُبح ہر شام میں ہے
سکُوں دِل کا مُضمر ترِے نام میں ہے

بظاہر زمینیں ہیں اور آسماں ہیں
تِری قُدرتوں کے یہ ادنےٰ نشاں ہیں

تِری شان کے اہل جانا نہ دُوجا
تُجھے سب نے مانا تُجھے سب نے پُوجا

مناظر میں تُو ہے نِگاہوں میں تُو ہے
کہ مُظلوم کے دِل کی آہوں میں تُو ہے

ہے زیبا تُجھے برتری کبریائی
تِرا نام لیتی ہے ساری خُدائی

تیری جُستجُو ہے تیرا آسرا ہے
کہ مانوسؔ کے لب پہ تِری ثنا ہے

غزلیں

گھڑی بھر کو میرے پہلو میں آؤ، چاند کہتا ہے
کسک سوئے ہوئے دل میں جگاؤ، چاند کہتا ہے

یہ عالم جگمگائے گا سحر پھر سے جواں ہوگی
رُخِ روشن سے زُلفیں تو ہٹاؤ، چاند کہتا ہے

بڑی مُدّت سے حسرت تھی کے دیکھوں ڈوبتا خود کو
نگاہوں سے نِگاہیں تو مِلاؤ، چاند کہتا ہے

میرے دل کی زمیں پر وہ یقیناً آج اُترے گا
کہ پلکیں راہ میں میرے بچھاؤ، چاند کہتا ہے

پُرانی ہی سہی یادوں کی چادر ہم کو ہے پیاری
ہواؤں سے نہ دامن کو چھڑاؤ، چاند کہتا ہے

کناروں کو جو پانی چھو گیا جل جائے گا دریا
نہ اُس کا نام ساحل پر لکھاؤ چاند کہتا ہے

نہیں مِل پائے گا تُم کو میرے محبوب کا ثانی
ہزاروں حُسن کے پیکر بناؤ، چاند کہتا ہے

سکوں مِل جائے ذہنوں کو دِلوں کو چین آجائے
کوئی تازہ غزل پھر سے سُناؤ، چاند کہتا ہے

نہ جاؤ چھوڑ کر تنہا ابھی حسرت نہیں نکلی
کہا میرا نہ مانو، مان جاؤ، چاند کہتا ہے

سمجھ کر تُم جنہیں قِسمت کے مارے، لوُٹ لیتے ہو
کئی معصُوم بچوّں کے سہارے، لوُٹ لیتے ہو

بھنور میں ڈُوبنے والوں سے کیا مطلب تمہیں تم تو
کھڑے ہوکر کنِارے سے نظارے، لوُٹ لیتے ہو

تڑپتا، چیختا ہے خوُف سے تب جھیل کا پانی
محافظ بن کے تم جس دم شکارے، لوُٹ لیتے ہو

بھروسہ کِس طرح تجھ پر کریں اے ناخُدا تم تو
پہنچتے ہی مُسافر کو کِنارے، لوُٹ لیتے ہو

ذرا سی بات پر بن کر فسادی، عقل کے دُشمن
مکینوں کی خُوشی، ارمان سارے ، لوُٹ لیتے ہو

تیری ہستی امیرِ شہر اُنہی کی بدولت ہے
کہ جن لوگوں کے اکثر تُم گزارے ، لوُٹ لیتے ہو

تمہاری شاعری میں حُسن ہے مانوس جادُو ہے
سُنا کر چند ہی اشعار پیارے، لوُٹ لیتے ہو

آن گرے جب پنچھی کے پر، سارے میری جھولی میں
آئے پھر الزام کے پتّھر، سارے میری جھولی میں

پہلے مجھکو بھیج دیا دُشمن سے لڑنے اُس نے پھر
ڈال دیئے کاغذ کے لشکر، سارے میری جھولی میں

چیخیں، آہیں، قہر، سلاسل، دہشت، زنداں، جلتے گھر
کرب زدہ لمحات کے منظر، سارے میری جھولی میں

میں نے اپنے دل میں سب کا درد بسایا یہ سُن کر!
ڈال دیئے قاتل نے خنجر، سارے میری جھولی میں

ترس رہی تھی جب یہ دھرتی قطرے کو اُس وقت بھی تھے
اَشکوں کے انگنت سُمندر ، سارے میری جھولی میں

رُوپ خُدا کا دھار کے پتّھر کور عقیدہ اگنی پتھ
خوف کے مارے آئے آزر ، سارے میری جھولی میں

اپنی پیاس، خِلش ، رسُوائی، درد، گھُٹن، وحشت اور غم
اپنے ہاتھوں ڈال دے آکر، سارے میری جھولی میں

کیا معلوم تھا اب کے موسم چھُل جائے گا نئے اُفق پر
خُود کی مانگی بارش سے گھر جُل جائے گا نئے اُفق پر

تب جا کر دھرتی کی آنکھیں کل کا سُورج دیکھیں گی جب
چنُدا اپنے بدن کی چاندی مَل جائے گا نئے اُفق پر

تہہ خانے والوں کو جانے کیوں اُمیّد ہے اِک دن یہ
وحشت کا گھنگھور اندھیرا ڈَھل جائے گا نئے اُفق پر

پہلے تو آدم نے پنچھی، پیڑ سبھی پامال کیے ۔۔۔!
کرنے کو فریاد یہ اب جُنگل جائے گا نئے اُفق پر

ہم نے اِن آنکھوں سے اُڑتے دیکھا ایک مداری کو
کب سوچا تھا اُس کا جادُو چل جائے گا نئے اُفق پر

جھُریوں میں ڈوبا اِک چہرہ آس لگائے بیٹھا ہے
اُس کا بیٹا آج نہیں تو کل جائے گا نئے اُفق پر

محنت کے اس پیڑ پہ خُوشبوں کا پھل آئے گا مانوسؔ
رفتہ رفتہ غم کا ہالہ گل جائے گا نئے اُفق پر

جہاں اُمید کی ٹہنی پہ کوئی پھول آیا ہے
وہیں پہ شر کی آندھی نے کوئی فتنہ اُٹھایا ہے

کہیں بھولے سے بھی شہرت کے جنگل میں نہ کھو جانا
پرندہ لوٹ کر تنہا یہی پیغام لایا ہے

اُجالے کے لئے کافی ہیں تیری یاد کے جگنو
ہوا نے اس لئے شاید چراغوں کو بجھایا ہے

لہو کی بارشوں نے زہر کی فصلیں اگائی ہیں
مگر الزام تو اِس گاؤں کے دہقاں پہ آیا ہے

کہیں اُمید کا سُورج نظر آتا نہیں ہم کو
یہاں لوگوں کے ذہنوں پر عجب سا خوف چھایا ہے

شجر سب کاٹ کر اب پُوچھتا ہے ہم سے وہ ناداں
جُھلستا جا رہا ہوں دُھوپ میں کیا کوئی سایا ہے

تشدّد کے زمانے میں ہمارا حوصلہ دیکھو
تعصّب کی زمیں پر پیار کا پودا اُگایا ہے

دکھا کے تیر فقط تم کمان رکھ دینا
ہدف بناؤ گے کِس کو نشان رکھ دینا

بہت غُرور پرُوں پر ہے جس پرندے کو
تُم اُس کے سامنے اُونچی اڑان رکھ دینا

سمیٹ لاؤ جب یادوں کی راکھ دامن میں
تو گھر کے طاق میں پھر شمعدان رکھ دینا

کبھی تو کوئی مُہاجر مکین بن جائے
کھُلا اِس غرض سے اپنا مکان رکھ دینا

مجھے نہ کاٹ یہ بولا ہے پیڑ بچّوں سے
سمجھ کے اپنے بزرگوں کی شان رکھ دینا

سُنائیں وقت کا نوحہ جسے پڑھ کر نسلیں
لہو سے لکھ کے کوئی داستان رکھ دینا

یہاں ہر شخص کے لہجے میں عجب تلخی ہے
سبھی کے مُنہ میں تُم میٹھی زبان رکھ دینا

برفیلی رُت آگ لگائے شاخوں پر
کوئی کیسے خواب سجائے شاخوں پر

پت جھڑ نے جب پیڑوں کو پامال کیا
تب موسم نے پھول کھلائے شاخوں پر

چاند کو چھونے کی ضد نے بدنام کیا
ہم نے تیرے نقش بنائے شاخوں پر

چاروں جانب اِک بجلی سی کوندگئی
ہم نے جب بھی گھر بنوائے شاخوں پر

سُورج کے اس غیظ سے پنچھی جھلس گئے
جانے کِس دن رحم یہ کھائے شاخُوں پر

ہم نے جس کا نام مسیحا رکھا تھا
اُس نے ہی پھندے لگوائے شاخُوں پر

فُرقت کے موسم میں شاید کام آئیں
ہم نے مِل کر گیت جو گائے شاخُوں پر

جھیل کا پانی آئینہ سا آج بھی ہے
چاند نے اپنے ہونٹ ہلائے شاخُوں پر

شہر میں ہم نے امن کا جب اعلان کیا
سارے پنچھی پلٹ کے آئے شاخُوں پر

میری نیندوں میں رُوز وشب نہ تُم آؤ تو بہتر ہے
میرے جذبات کا شعلہ نہ بھڑکاؤ تو بہتر ہے

تیری زُلفوں کے پیچ وخم میں رستہ بھُول جاتا ہوں
ہوا کے دوش پر زُلفیں نہ بکھراؤ تو بہتر ہے

ہزاروں لُٹ چکے پہلے تیری دِلکش اداؤں پر
دوپٹہ تم اگر سر سے نہ سرکاؤ تو بہتر ہے

مچل اُٹھیں گی موجیں آگ لگ جائے گی پانی میں
جو ننگے پاؤں ساحل پر نہ تم آؤ تو بہتر ہے

بھٹکتا پھر رہا ہوں آج تک یادوں کے جنگل میں
مُسافر کو وفا کی راہ دِکھلاؤ تو بہتر ہے

تمہارے لمس نے صندل معطر کر دیا تو کیا
یہ مُرجھایا ہوا گلشن بھی مہکاؤ تو بہتر ہے

تیرے در سے اُجالا مانگتا ہے چاندراتوں کا
میری تقدیر کے جگنُوں کو چمکاؤ تو بہتر ہے

میرے اندر کی یہ دھرتی بہت پیاسی ہے مُدت سے
جوبن کے پیار کا بادل برس جاؤ تو بہتر ہے

وہ جس موسم میں یہ پنچھی بچھڑ کر ڈار سے رویا
وہی موسم خزاں سے مانگ کر لاؤ تو بہتر ہے

نفرت کا اپنے دل میں کوئی ناگ پال کر
اجداد کی زمیں کو نہ یوں خُوں سے لال کر

اس نفرتوں کے دور میں ہے میری التجا
رکھنا محبّتوں کی وراثت سنبھال کر

کیا ہوں میں ، کون ہوں میں، ہے میرا مقام کیا؟
آمجھ سے آج پھر وہ پُرانے سوال کر

کوئی میرے رفیق سے پوچھو تو یہ سوال
کیا مِل گیا اُسے میری پگڑی اُچھال کر

دعوے کیا تھا جس نے محافظ کے نام کا
وہ چل دیا ہے خواہشِ دِل کو نکال کر

آما جگاہ شر ہے یہ دُنیا نہیں ہے اب
رکھنا قدم فرشتوں ! یہاں دیکھ بھال کر

منسوب تیرے نام سے ہو جائے تیرا شہر
قائم تو ایسی شہر میں اپنی مثال کر

دُنیا کی اِک فقیر نے کچھ یُوں مثال دی
مُٹھی میں لے کے خاک ہوا میں اُچھال دی

چُپ چاپ میری پُشت پر اُس نے کیا ہے وار
جس کو کہ میں نے جنگ میں کل اپنی ڈھال دی

نظریں چُرا کے میرے گماں کو یقیں کیا
دل میں جو ایک پھانس تھی وہ بھی نکال دی

چاہا تھا بادلوں میں سے دیکھیں ہلال عید
اُس نے نقاب اُلٹ کے یہ حسرت نکال دی

اُلجھا کے مجھ کو باتوں ہی باتوں میں دوستو
پھر اُس نے کل کی کل یہ مُلاقات ٹال دی

شفق لکھوں، صبا لکھوں، دھنک لکھوں، غزل لِکھوں
مہکتا پھول اُس کو چاند کا نعم البدل لِکھوں

مدُھر جو بن، حسیں مُکھڑا، وہ چنچل، شوخ تتلی سی
جوانی کے سمندر میں اُسے کِھلتا کنول لکھوں

بَلا کی شوخیاں اُس میں جھنکتی پیر میں پایل
اُسے میں چودھویں شب میں محبّت کا محل لِکھوں

وہ بھیگے جِسم سے اس دل کو گھایل کر گئی کِتنا
کبھی جب پاس بیٹھے تو قیامت کے وہ پل لِکھوں

وہ بِکھرائے اگر زُلفیں تو ساون کی گھٹا چھائے
سُلگتی دُھوپ میں اِن ہی ہواؤں کو میں چل لِکھوں

کیوں سوچتا ہوں میں کہیں ایسا ہوا نہ ہو
گھر پھونکنے میں ہاتھ دیئے کا رہا نہ ہو

یوں پردہ اُفق پہ جو اُبھرا ہے آفتاب
دلِ کا لہو فضا میں اُچھالا گیا نہ ہو

ارزاں بہت ہے آج کے انسان کا لہو
وہ کون سی جگہ ہے جہاں یہ گرا نہ ہو

منڈلا رہے ہیں اِس لئے شاید یہاں پہ گدھ
مُردہ کسی کا جِسم سڑک پر پڑا نہ ہو

روتی ہے ایک جھونپڑی اس سرد رات میں
کہرے کی زد میں آکے کوئی مر گیا نہ ہو

کیا عدل ہے کہ تم رہو سُورج لئے ہوئے
مُفلس کے گھر میں مٹی کا اِک بھی دیا نہ ہو

تعمیر آؤ ایسے کریں اب سماج کی
مندر میں مسجدوں میں جہاں فاصلہ نہ ہو

ہم کو بھی اپنی دُعاؤں کا اثر مِل جائے گا
جب کڑکتی دھوپ میں سایہ شجر مِل جائے گا

کب تلک بھٹکیں گے ہم بن کر یہاں خانہ بدوش
اس زمیں پر ایک دن ہم کو بھی گھر مِل جائے گا

پیار کے یہ خشک پتّے ساتھ مت رکھ شہر میں
کیا خبر کس موڑ پر کوئی شَرر مِل جائے گا

خُون پینا چھوڑ دے گی جب یہ نفرت کا زمیں
سب کو اپنی اپنی محنت کا ثمر مِل جائے گا

دیکھ لیں گے اپنا چہرہ پتھّروں کے شہر میں
آئینہ سالم یہاں ہم کو اگر مِل جائے گا

لشکرِ خوں تشنہ ہے اس شہر کے سر پر سوار
ہر قدم پر آپ کو اک نوحہ گر مِل جائے گا

کربلا کو اک زمانہ ہو گیا لیکن یہاں
آج بھی بہر و بیابن کربلا مِل جائے گا

پھول، خوشبو، دِلکشی، حُسن و جوانی دیکھ کر
شاعری کرنے کا تم کو بھی ہُنر مِل جائے گا

عزم کا لے کر سہارا چل پڑو مانوسؔ تم
راہ میں تُم کو یقیناً ہی قمر مِل جائے گا

گرے ہوؤں کو اُٹھائیں ، تو عید ہوتی ہے
دلوں سے بُغض مٹائیں ، تو عید ہوتی ہے

کسی غریب کا چُولہا جلا کے دیکھ ذرا
کِھلا کے اُن کو جو کھائیں ،تو عید ہوتی ہے

جہاں میں سینکڑوں بیوہ، یتیم بچّوں سے
جومِل کے عید منائیں ، تو عید ہوتی ہے

کسی کے عیب عیاں کر کے کُچھ نہیں مِلتا
کسی کے عیب چھپائیں ، تو عید ہوتی ہے

یتیموں، بے کسوں افسردہ حال چہروں پر
خوشی کے پھول کھلائیں تو عید ہوتی ہے

وطن سے دُور غمِ روزگار میں تنہا
ملیں جو ماں کی دُعائیں ، تو عید ہوتی ہے

ضیافتوں کی نہیں فکر کچھ ہمیں مانوسؔ
حلال رزق جو کھائیں ، تو عید ہوتی ہے

جب تلک جذبات کا شعلہ جواں ہوگا نہیں
اُس گھڑی تک رازِ اُلفت بھی عیاں ہوگا نہیں

دار پر چڑھ کر فقط اتنا کہا منصور نے
عشق ایسی آگ ہے جس میں دُھواں ہوگا نہیں

اس زمین پر پاؤں رکھنے سے جو کرتے ہیں گریز
مہرباں اُن پر کبھی یہ آسماں ہوگا نہیں

پیار سے غیروں کے دِل میں جو بنالے گا جگہ
اس جہاں میں وہ یقیناً بے مکاں ہوگا نہیں

اُن کی قُربت کی مُعانی اِس سے بڑھ کر اور کیا
فی الحقیقت کوئی لمحہ رائیگاں ہو گا نہیں

تم اگر یہ حوصلہ ہم کو عطا کرتے نہیں
مُدعا دِل کا کبھی ہم سے بیاں ہو گا نہیں

ہم اگر مانوس صرف اپنے گھر کو دیکھتے
سچ ہے اِس بستی کا بھی نام ونشاں ہو گا نہیں

نہ ایسے لیجیے انگڑائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
بڑھیں گی اور بھی رُسوائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

نہ جاؤ چھوڑکر یارو تم اپنے گاؤں کی مٹیّ
ملِیں گی شہر میں تنہائیاں ، کیا ہم نہ کہتے تھے

عقیدوں کی طرح مت بانٹنا سوُرج کو خانوں میں
بکھرِ جائیں گی سب پر چھائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

بنانا راہنما اپنا کبھی مت کور چشموں کو
تمہیں کھا جائیں گی یہ کھائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

جُنوں میں لے کی ڈوبی ہے تمھیں اِک سیپ کی خواہش
کبھی مت ناپنا گہرائیاں ، کیا ہم نہ کہتے تھے

اگر اِک باپ نے سب بیچ کر بیٹی بیاہی تو
سِسک اُٹھیں گی سب شہنائیاں ، کیا ہم نہ کہتے تھے

تیری بستی کو نظرِ بد اگر مانوس لگ جائے
نہیں لکھ پاؤ گے چُوپائیاں ، کیا ہم نہ کہتے تھے

"میں کاغذ کے سیاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں"
خیالوں میں کبھی یلغار کے منظر بناتا ہوں

ابھی اتنا بھروسہ ہے مجھے اپنی اُڑانوں پر
جبھی تو میں پرندوں کے ہوا سے پر بناتا ہوں

جھلک اِک بار دیکھی تھی نہ جانے کب مگر اب تک
تصور میں اُسی بے لمس کے پیکر بناتا ہوں

مجھے اچھّی طرح معلوم ہے انجام کیا ہوگا
مگر اِک شوق! پھر بھی ریت کے میں گھر بناتا ہو

میرے ہاتھوں کو قُدرت نے ہُنر بخشا ہے کچھ ایسا
میں پتھّر کو بھی چھُولوں تو اُسے گوہر بناتا ہوں

مِرے بچے سہم کر سب شرارت چھوڑ دیتے ہیں
کہ موٹی ایک رسی کا میں جب اجگر بناتا ہوں

تمہاری یاد کے اوراق جو بکھرے تھے کمرے میں
کتابِ دل انہیں ترتیب سے رکھ کر بناتا ہوں

سُرمئی شام جو آئے تو تُجھے خط لِکھّوں
چاند گُھونگھٹ جو ہٹائے تُجھے خط لِکھّوں

مُضطرب کتنے ہی غُنچے ہیں چٹکنے کے لئے
پھُول بھنورا جو کھلائے تو تُجھے خط لِکھّوں

دُھوپ کی آنچ سے کلیوں کے بدن جلتے ہیں
پھُول شبنم میں نہائے تو تُجھے خط لِکھّوں

کب سے بیٹھا ہوں یہاں عالم تنہائی میں
گیت کویل جو سُنائے تو تجھے خط لِکھّوں

کتنے ارمان مرے دل میں مچلتے ہیں مگر؟
ہاتھ سینے پہ یہ جائے تو تُجھے خط لِکھّوں

التجا میری ہے پردیس میں رہ کرائے دوست
تو مجھے بُھول نہ جائے تو تُجھے خط لِکھّوں

مجھ کو معلوم نہیں تیرا ٹھکانہ مانوسؔ
تیرا پیغام جو آئے تو تُجھے خط لِکھّوں

شہر میں اَندھوں کو آیئنے دکھاتا کون ہے؟
بے در و دیوار کے یہ گھر بناتا کون ہے؟

اجنبی ہیں میں انہیں سمجھاؤں کیا اور کس طرح
بند دروازوں پہ آوازیں لگاتا کون ہے؟

رات کی دہلیز پر تو چاند ابھی اُترا نہیں
اتنی جلدی سے اُجالوں کو بُلاتا کون ہے؟

اُس کی مجبوری ہے کیا یہ جانتے، تو جانتے
بھوکے بچّوں کو چٹائی پر سُلاتا کون ہے؟

دفعتاً یہ شہر ڈوبے گا اندھیرے خول میں
اپنی مُٹھی میں یہ سورج کو چھپاتا کون ہے؟

سرپھری ہوتی ہیں لہریں کیا نہیں معلوم اُسے
ریت پر ساحل کی تصویریں بناتا کون ہے؟

ایک مُٹھی چھاؤں کو ترسو گے اک دن سوچ لو
آنگنوں سے پیڑ پودوں کو کٹاتا کون ہے؟

ہے بھروسہ دُشمنوں کی ذات پر مجھ کو مگر
دوستوں کے بھیس میں خنجر چلاتا کون ہے؟

کون ہے دُشمن چناروں کا ذرا ڈھونڈو بھی
خشک پتوں کو یہ چنگاری دِکھاتا کون ہے؟

جاتے جاتے تری یادوں کا اثر جائے گا
غم تو چڑھتا ہوا دریا ہے اُتر جائے گا

دیکھ کر میری نِگاہوں میں وہ صوُرت اپنی
کیا خبر تھی کہ مرے دل میں اُتر جائے گا

دید کی پیاس تُو کچھ روز ٹھہر جائے گی
دے کے اشکوں کی وہ سوغات اگر جائے گا

وہ ہے صندل اُسے ہرگز نہیں چھو نا سائیں
ورنہ خوشبو کی طرح تُو بھی بکھر جائے گا

لاکھ تو بند کرے گھر کے دریچوں کو مگر
چاند تو چاند ہے کسی اور کے گھر جائے گا

اُس نے بھیجا ہے مُجھے لکھ کے یہی پیپل پر
اسی پتے کی طرح تو بھی بکھر جائے گا

پھر بھی سچ بولنے کا عزم کیا ہے مانوسؔ
جب کہ معلوم ہے یہ میرا ہی سر جائے گا

گھر کی ہر چیز بکھر جائے گی بٹوارے میں
جب بھی دیوار اُٹھے گی تو شجر جائے گا

مُسافتوں میں یُوں ہمت سمیٹ کر لائے
کہ جیسے مُشت میں پربت سمیٹ کر لائے

رگوں میں خُون شرافت کا جم گیا جب تو
فسادیوں سے حرارت سمیٹ کر لائے

شباب، حرص وہوس آبرُو کی منڈی میں
کہاں سے کوئی شرافت سمیٹ کر لائے

سمجھ سکو تو یہی کہہ رہے ہیں سناٹے
ہر ایک شخص سماعت سمیٹ کر لائے

کسی نے عقل سمیٹی کسی نے زر ہم تو
امیرِ شہر سے شہرت سمیٹ کر لائے

وفا، خلوص، مروّت، اُمید کے بدلے
ہم اپنے شہر سے ہجرت سمیٹ کر لائے

وہ جس غریب کو روندا تھا رات آندھی نے
نہیں ہے اُس میں سکت چھت سمیٹ کر لائے

جو روز خواب میں دیتا ہے تتلیاں ہم کو
اُسے کہو کہ حقیقت سمیٹ کر لائے

سُنا تھا سچ پہ وہ سنگسار کرتا ہے
جبھی تو ہم بھی جسارت سمیٹ کر لائے

ہمارے خواب کی تعبیر کتنی تیکھی ہے
زمیں سے چاند پر پہنچے ہیں زندگی کے لئے

ہر ایک شخص کو غوطہ زنی نہیں آتی
"سمندروں میں ہیں گوہر کسی کسی کے لئے"

وہ جھونپڑا جو مکانوں میں رہ گیا گھر کر
ترس رہا ہے ہوا اور روشنی کے لئے

اُسی کے حصّے میں آئی ہے ساری تاریکی
تڑپ رہا ہے جو مُدت سے چاندنی کے لئے

بچھڑ کے تُم سے یہ احساس ہوگیا مجھ کو
تمہارا ساتھ ضروری ہے زندگی کے لئے

وہیں یہ صُبح پتنگوں کی لاش پاؤ گے
جہاں پہ شمع جلاؤ گے روشنی کے لئے

وہ آرزوؤں کے ہوں داغ یا کہ فُرقت کے
کوئی تو درد ضروری ہے شاعری کے لئے

وہ ایک شخص بہت ہے بُلند قد مانوسؔ
جو سب سے ملتا ہے جھک کر قد آوری کے لئے

نگاہوں سے میری گذرے گا جب اخبار ، وادی کا
مجھے یاد آئے گا ہر گنبد و مینار، وادی کا

نظر میں گھومتے ہے دل میں اک ہلچل مچاتے ہیں
چنار اُس کے سفیدے اور شالیمار ، وادی کا

وہ برفیلی چٹانیں چاندنی شب کیسے بھولوں میں
وہ باتیں چرخ سے کرتا ہوا دیودار ، وادی کا

حسیں گلمرگ، ڈکسم، باغ شالیمار، حضرت بل
سبھی کچھ دیکھ کر ہم نے کیا دیدار، وادی کا

جنوں کی حد تلک ہیں دل نشیں وادی کے نظارے
دل و جاں پر مسلط ہو گیا ہے پیار ، وادی کا

وفا، شائستگی، مہماں نوازی کا جو پیکر تھا
ابھی تک ہے دلوں پر نقش وہ کردار، وادی کا

یہی معراج ہے در اصل بیمارِ محبت کی
ہر اک دھڑکن میں دل کی بس گیا ہے پیار، وادی کا

اُتارے کس طرح جذبات کو رنگوں کے کینوس پر
ہُوا ہے اس قدر مجبور ہر فنکار، وادی کا

مِلا تھا جو کبھی ڈل کے کنارے مجھ سے اے مانوس
بسا اوقات یاد آتا ہے وہ اِک یار ، وادی کا

ہُنر تم کو بھی آدم ایک دن ایسا سکھا دے گا
فرشتو! آپ کو بھی ایک دُوجے سے لڑا دے گا

کبھی جن بستیوں میں دَب چکے تھے راکھ میں شعلے
اُنھیں اِک فتنہ گر اِک دن مذاہب کی ہوا دے گا

اُسے شاید نہیں ہے فکر کوئی اپنی نسلوں کی
زمیں پر اِس لئے وہ زہر کی فصلیں اُگا دے گا

مُقیّد آج تک ہیں جال میں سہمے ہوئے پنچھی
کوئی بن کے تمنا ایک دن اُن کو اڑا دے گا

وہ ننھّی فاختہ اس آس پر بیٹھی ہے ٹہنی پر
کہ اُجڑے گلستاں سے کوئی تو اُس کو صَدا دے گا

میں جادُو مان جاؤں گا فقط اُس اِک سپیرے کا
صدا پر بین کی جو میری ناگن کو بُلا دے گا

ہتھیلی پر جو میرا نام لکھ کر چوم لیتا تھا
خبر کیا تھی کہ جا کر دُور مجھ کو بھُلا دے گا

پیڑ کا پھل تو کھائے گا پتھر
میرے آنگن میں آئے گا پتھر

جس نے سچ بولنے کا جُرم کیا
اُس کو کیسے بچائے گا پتھر

نفرتیں، آگ، خُون اور لاشیں
دیکھ کر تلمِلائے گا پتھر

گھاوَ اپنا کوئی نہ دیکھے گا
ہاتھ میں جب اُٹھائے گا پتھر

آگ جس نے لگائی نفرت کی
اُس کے گھر تک بھی جائے گا پتھرؔ

دیکھ کر آدمی کا وحشی پن
ایک دن ہار جائے گا پتھرؔ

مندرو مسجدوں میں ٹکراؤ
دیکھ کر ٹوٹ جائے گا پتھرؔ

جب بھی ترشے گا میرے ہاتھوں سے
اپنی قسمت جگائے گا پتھرؔ

قہر بن جائیں گے اُسی کے لئے
جو بھی ہم کو دکھائے گا پتھرؔ

چاند کی آنکھوں میں کیونکر رتجگے کی پیاس ہے
نیند کا گہرا سمندر بھی تو اُس کے پاس ہے

جھومتا ہے بے طرح اب دیکھ کر پت جھڑ کی رُت
بُوڑھے برگد کو یہی انداز شاید راس ہے

ایک ماں دہلیز پر ہے لے کے ہاتھوں میں چراغ
اُس کا بیٹا لوٹ آئے گا اُسے کیوں آس ہے

جذب ہو کر رہ گیا ہے قطرہ قطرہ خُون کا
پھر فسادوں کو بُلاتی آنگنوں کی پیاس ہے

آسمانوں سے اُترتی آندھیو! یہ سوچ لو
کیا اُڑا لے جاؤ گی اب کیا ہمارے پاس ہے

سونے چاندی کے نوالے تولتے ہونگے رئیس
برتنوں کی بُھوک کا اُن کو کہاں احساس ہے؟

رام کو تو آج بھی سونے میں تولے ہے سماج
اور سیتا کا مُقدر آج بھی بن باس ہے

میں اپنے آپ کو ہرگز خُدا ہونے نہیں دوں گا
یہ ناطہ روح کا تجھ سے جُدا ہونے نہیں دوں گا

میں کشتی ہوں سمندر میں وہ میرا ناخُدا پھر بھی
کناروں سے میں خود کو آشنا ہونے نہیں دوں گا

عذابِ خونچکاں در یا یہ آنکھیں دیکھ تو لیں گی
مگر اپنی زباں کو بے صدا ہونے نہیں دوں گا

یزیدو کاٹ لو سر جتنے چاہو اِس گھڑی تم! پھر
کسی بھی شہر کو میں کربلا ہونے نہیں دوں گا

یہ کرنیں پھول سے شبنم کی نسبت پوچھ بھی لیں تو
بیاں میں اپنے دل کا مدّعا ہونے نہیں دوں گا

اُداسی دے کے سورج ڈھل گیا تو چاند یہ بولا
تجھے اے شب کبھی بے آسرا ہونے نہیں دوں گا

کہے صیاد بلبل سے تڑپ جتنا تڑپنا ہے
گلوں کی چاہ میں تجھ کو رہا ہونے نہیں دوں گا

کُھلا صیاد نے رکھا ہے پنجرہ آج کے دِن بھی
نہ جانے پھر بھی کیوں پنچھی رِہا ہونے سے ڈرتا ہے

چناروں سے لپٹ بیٹھی ہیں پھر سے آگ کی لپٹیں
اب اِن کی چھاؤں میں خُود چاند بھی سونے سے ڈرتا ہے

ہمارے آنگنوں میں پھر سُمندر ہے عذابوں کا
کوئی بھی آستیں اپنی یہاں دھونے سے ڈرتا ہے

صلیبوں کو عطا کی لا زوال اِک زندگی جس نے
وہی اب جسم کو اپنے یہاں کھونے سے ڈرتا ہے

جو رہتا ہے مہاجر کے مکاں میں ایک مدت سے
وہی اس شہر میں اب بے مکاں ہونے سے ڈرتا ہے

سمٹ جاتے ہیں بس اِک چاپ سُن کر ہی مکیں اتنے
کوئی معصوم بچّہ بھی یہاں رونے سے ڈرتا ہے

گلے میں سانپ ڈالے کُو بہ کُو پھِرتا ہے اِک سادھُو؟
وہ کربِ ذات کا اِک بوجھ یاں ڈھونے سے ڈرتا ہے

میرے خُدا مجُھے اِک لمحہ معتبر دے دے
پھر اُس کے بعد اذیت تو عُمر بھر دے دے

یزید آج بھی رُسوا ہو جس کے اُٹھنے سے
کِسی شُجاع کا نیزے کو ایک سر دے دے

مِٹائے ظُلمتِ شب کو جو نُور سے اپنے
اُسی رسولؐ کے صدقے میں اِک سحر دے دے

جُھلس گئے ہیں پرندے، جُھلس گئی ہے زمیں
سُلگتی دُھوپ ہے صحرا کو اِک شجر دے دے

بچا کے جان میں بستی سے بھاگ آیا ہوں
مِرے خُدا مجُھے جنگل میں ایک گھر دے دے

پھر اُن کو اُڑنے کے احکام ہیں بجا لیکن
قفس میں قید پرندوں کو بالِ و پر دے دے

گھروں کو اپنے وہ آجائیں لوٹ کر اِک دن
میری دُعا میں اجابت کا اِک اثر دے دے

گھر جلانے جا رہا ہوں اپنا میں
شہر والوں گل کرو سب بتیاں

دستِ حاتم میں بھی اب کشکول ہے
وقت کی یہ ذِلتیں یہ سختیاں

جس نے دیکھے جاگتی آنکھوں سے خواب
کیا بھلا لے آئے گا وہ سیپیاں

بن ہی جائے گا امیرِ شہر وہ
بیچنے دو اُس کو پہلے پھرکیاں

سر پھری آندھی اڑا کے لے گئی
تیرے میرے نام کی سب تختیاں

فاصلے مِٹ جائیں گے اِک پل میں بس
کھول دینا دل کی ساری کھڑکیاں

ڈل کا پانی پی گئیں سب مچھلیاں
ساحلوں پر تیر تی ہیں کشتیاں

کب تلک دیکھوں تماشہ دُور سے ؟
جل رہی ہیں شہر کی سب بستیاں

کِس طرح تاریخ لکھّوں عصر کی
کاٹ کر وہ لے گیا ہے اُنگلیاں

میں نہیں کہتا خُدا بے گھر ہوا
یہ تو اِک اخبار کی ہیں سُرخیاں

کیا یہاں بھی سر کٹے لاشیں گریں
اِس لئے سُوکھی پڑی ہیں کھیتیاں

اگر خیرات میں یہ حُسن بٹ جائے تو کیا کہنا
تمہاری دید میں ہر لمحہ کٹ جائے تو کیا کہنا

تمہارے حُسن کے آگے فرشتے سر جھُکاتے ہیں
فلک پر چاند پل بھر میں جو گھٹ جائے تو کیا کہنا

نزاکت، شوخیاں ، شبنم، تبسّم، دلکشی، کرنیں
یہ سب کچھ ایک کُوزے میں سِمٹ جائے تو کیا کہنا

یہ خُوشبوں کا بدن لے کر نہ نکلو سیر کو تنہا
کوئی بھنورا جو دامن سے لپٹ جائے تو کیا کہنا

تیرے پازیب کی جھنکار پر اب دھڑکتا ہے دِل
نقابِ حُسن بھی پل بھر کو ہٹ جائے تو کیا کہنا

ترے رُخسار کو چُھو کر ہَوا تو خُوش ہوئی لیکن
تمہارے گیسوؤں میں چاند اَٹ جائے تو کیا کہنا

تیری آغوش میں مانوسؔ کا سر دیکھ کر اِکدن
فرشِتہ موت کا در سے پلٹ جائے تو کیا کہنا

حُسینی قافلے کا واقعہ جب بھی بیاں ہوگا
مِرا زخمی قلم مظلُومیت کا ترجماں ہوگا

ابھی سب کے لبوں پر ہیں میرے اشعار لیکن کل
ورق اِک اِک صحیفے کا میری ہی داستاں ہوگا

سمجھ کر دُھند جس کو آپ نے منظر سجائے ہیں
یقیناً وہ کِسی مظلُوم کے گھر کا دُھواں ہوگا

پِگھل جائے گی رِشتوں کی یہ سِل اِک دن مگر پھر بھی
یہ پانی بن کے یادیں دِل کے دریا میں رَواں ہوگا

یہ خوشبو، دھوپ، شبنم، رنگ موسم، کہکشاں سب کچھ
سمٹ کر حُسن بن جائیں گے جب تک وہ جواں ہوگا

اندھیری رات میں مُفلس کوئی جب چاند دیکھے گا
تڑپ اُٹھے گا بھوکا اُس کو روٹی کا گماں ہوگا

خلاؤں میں بھٹکتا اِک پرندہ سوچتا ہے یہ
لہو کے شہر میں کِس چھت پہ اُس کا آشیاں ہوگا

ہونٹوں سے لگانے کے قابل ہیں تری آنکھیں
چاہت کے سمندر کا ساحل ہیں تری آنکھیں

یادوں کے گھروندے جب مل جل کے بنائے تھے
اُن چاندنی راتوں کا حاصل ہیں تری آنکھیں

مُجھ سے مرے خوابوں کو چھینے گا کوئی کیسے ؟
جب تک مری نیندوں میں شامل ہیں تری آنکھیں

اُمید کی جھیلوں میں اِک کرب سا اُٹھا ہے
اس دردِ مسلسل سے غافل ہیں تری آنکھیں

دیکھو نہ مجھے ایسے مرجاؤں گا غش کھا کے
کہتا ہے جہاں سارا قاتل ہیں تری آنکھیں

راکھ کا اِک ڈھیر بن کر بستیاں سب رہ گئیں
کیا بتاؤں کسطرح آنکھیں یہ منظر سہہ گئیں

یہ تماشا دیکھکر حیران و ششدر رہ گیا
کھیت سے جب گاؤں کے دھاریں لہو کی بہہ گئیں

تھا بظاہر پُر سکوں گہرے سمندر کا مزاج
داستانِ درد اُس کی مچھلیا ں جب کہہ گئیں

وصل کے موسم میں پگھلی برف جسموں کی مگر
ذہن میں پھر بھی عجب چنگاریاں سی رہ گئیں

گھونسلے یادوں کے اب پھر مت بنانا پیڑ پر
سُن لیا مانوس کیا پاگل ہوائیں کہہ گئیں

ایک جامِ ارغوانی بھیج دو کشمیر سے
اور وہ راتیں سُہانی بھیج دو کشمیر سے

مضطرب پردیس میں بیٹھا ہوں تیری یاد میں
اور تھوڑی بیکرانی بھیج دو کشمیر سے

نیند بن کر جو مری آنکھوں میں رہتی ہے صدا
وہ مرے خوابوں کی رانی بھیج دو کشمیر سے

پیاس بُجھ جائے گی آنکھوں کی مرِی گر تم مُجھے
ایک پیالہ ڈل کا پانی بھیج دو کشمیر سے

مُنتظر مضمون کی ہے بس میری نوکِ قلم
درد و غم کی اِک کہانی بھیج دو کشمیر سے

وہ سویٹر اور مفلر اب پُرانے ہو گئے
پھر کوئی تازہ نِشانی بھیج دو کشمیر سے

نامہ بر پر اُٹھ گیا مانوسؔ میرا اعتماد
خیریت اپنی زبانی بھیج دو کشمیر سے

اُس کا بس خُود ہی سے رشتہ تھا شاید
اسی لیے پھر آج وہ تنہا تھا شاید

ہلکی سی آواز سُنی میں نے پھر سے
اُس کے اندر سے کچھ ٹُوٹا تھا شاید

اُس کی ضِد نے ہاتھ قلم کروا ڈالے
نام کِسی کا ہاتھ پہ لِکھا تھا شاید

رشتوں کی زنجیر سے تھا بالکل آزاد
اپنوں سے کچھ سوچ کے بچھڑا تھا شاید

جانے کھڑکی کے دونوں پٹ کیسے کھُلے؟
کوئی اُس دہلیز سے گُزرا تھا شاید

سُورج کی کرِنوں کا اُس کو خوف نہ تھا
وہ خُود ہی افلاک سے اُترا تھا شاید

سب چڑیوں نے شور مچایا اُڑ اُڑ کر
آدم جنگل میں آپہنچا تھا شاید

توڑ کر میں اِس قفس کو جب رِہا ہو جاؤں گا
پھر کسی مظلوم و بے بس کی صدا ہو جاؤں گا

میں یہ سورج سے کروں گا گفتگو پچھلے پہر
دو پہر کی دھوپ میں اب میں کھڑا ہو جاؤں گا

چاندنی سے کھیلتے تجھ کو اگر میں دیکھ لوں
پھر ترِی دہلیز کا میں بھی دِیا ہو جاؤں گا

لق ودق صحرا میں خود کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
ایک دن میں اُن کے ہونٹوں کی دعا ہو جاؤں گا

ذات کا اپنی تحفّظ کر نہ پاؤں میں اگر
ایک قطرے کی طرح میں بھی فنا ہو جاؤں گا

نظمیں

سجدے میں تو

میری سوچ بھی کتنی محدود نکلی

میں یہ سوچتا تھا؟

تیرا گھر کہاں ہے؟

تو مجھکو نہیں کیوں دکھائی ہے دیتا

اگر تجھ کو ملنے کی کوشش کروں تو

کہاں تجھکو ڈھونڈوں؟

میری بات سُن کر تھے احباب کہتے

کہ پاگل ہوا ہے، صنم ڈھونڈتا ہے

مگر وہ کیا جانیں میرے دل کی باتیں

میں کچھ سوچتا ہوں، وہ کچھ سوچتے ہیں

اچانک میری سوچ بڑھنے لگی جب

تو کانوں میں میرے یہ آئی نداتب

ارے کم عقل تو ذرا دل میں جھانک

جسے ڈھونڈتا ہے تیرے پاس ہے وہ

یہ معلوم آواز سُن کر لگا

تجھے ڈھُونڈنا کوئی مشکل نہیں

کہ محسوس کرنے کی تو چیز ہے اور

نہیں دُور تو میرے دل میں مکیں ہے

تیرے واسطے ہی یہ میری جبیں ہے

تصور میں تجھ کو بسا کر میں اپنے

تری یاد میں ایک سجدہ کروں اور

زباں پہ میری ہو سُبحانَ رَبّیِ اَ الْاَ علٰے

یہ محسوس ہوگا تو ہے سامنے اور

میں سجدے میں دیدار کرلوں تمہارا

چلۂ کلان کا ایک منظر

برف کی چادروں میں ٹھٹھرتے ہوئے

پھول سے کچھ بدن

پھرن پہنے ہوئے

کانگڑی کو دبائے ہوئے گود میں

ننھی آنکھوں میں حسرت

لیئے دید کی

ایک کھڑکی کے پٹ کھول کر دیر تک

فکر میں ڈوب کر

سوچتے ہیں یہی

گھر سے نکلا ہوا

جانے کب آئے گا؟

باری باری ہمیں لے کے آغوش میں

روز ہی کی طرح شام ڈھلتے ہوئے

وقت کی سرپھری آندھیوں میں یہاں

گزرے موسم میں مسلی گئیں خوشبوئیں

کٹ گئے راہ میں کتنے کڑیل شجر

بے خبر باغباں دیکھتا رہ گیا

اُن کی بابت ہمیں

کپکپاتے لبوں سے کہانی کوئی

کون دوہرائے گا ؟

اور آنکھوں کو اشکوں سے بھر جائے گا

کانگڑی میں پڑے بجھ رہے کوئلے

اور دہکائے گا، ہم کو تڑپائے گا

پت جھڑ کی وہ شام

پت جھڑ کی وہ شام سُہانی
بھُول نہیں پاتا ہوں اب تک
آنگن میں جب کُرسی ڈالے
ایک نظارہ دیکھ رہا تھا
سپنوں کے سُندر گاؤں سے
بھینی بھینی خُوشبو لے کر
پھُولوں کی سُوکھی بیلوں میں
رنگ برنگی نازک تتّلی
سہمی۔ سمٹی اور جھُجھکتی
موت سے اپنا آپ بچائے
اک چڑیا سے بھاگ رہی تھی
میرے منہ سے ہش ہِش سُن کر

وہ چڑیا تو بھاگ گئی پر۔۔۔۔

میری بچّی جو تتلی کو

جانے کب سے تاڑ رہی تھی

پلک جھپکتے اُس پر جھپٹی

پھر جب بیلوں سے وہ نِکلی

پھُدک پھُدک کر بول رہی تھی

پاپا میں نے اک تتلی کی

دو تتلیاں کر ڈالیں

عید کیسے منائیں بتاؤں ذرا؟

سر بُریدہ، جسم تشنہ لب ہیں طِفل

جاں بلب ہر بشر، شہر ماتم کناں

گرم شعلوں میں جذبات جھلسے ہوئے

آس، اُمید کی ہر عمارت گری

باغ کی ادھ کِھلی کلیاں مسلی گئیں

لب پہ کردی ثبت خامشی کی مہر

اس طرح ہم سے ہر اک نِدا چھین لی

جبر و دہشت یزیدوں کا ہر سو بپا

خُوں شہیدوں کا ہر گھر میں بولتا

ظُلم و بیداد کا اک عجب سِلسِلہ

چاہے کشمیر ہو یا کہ ہو گودھرا

ہر جگہ دیکھ سکتے ہو کرب و بلا

بر بریت پہ آنسو بہاتی صُبح

قلبِ سوزاں میں ہر شام ڈوبی ہوئی

کانپتے بام ودر، ہر گلی نوحہ گر

شہر میں چار سے ایک کہرام سا

دیکھ کر ہر کوئی آنکھ پرنم ہوئی

اتنا کچھ دیکھ کر رو پڑیں سنگ بھی

غم کی برسات میں ایسے حالات میں

عید کیسے منائیں بتاؤ ذرا؟

تُم کو ہوگی خوشی ہم کو کیسی بھلا؟

تُم نے دیکھا نہیں ہے ابھی کربلا

عید کیسے منائیں بتاؤ ذرا؟؟؟

ٹھہرا ہوا منظر

ڈل کا حسین منظر،

اور تیرتے شکارے

لہروں پہ بن کے دُلہن یوں جھلملا رہے ہیں

کافی سیاح کنارے پر مُسکرا رہے ہیں

کشمیر آکے رونق ڈل کی بڑھا رہے ہیں

ہنسوں کا ایک جوڑا ڈبکی لگا لگا کے سب کو لُبھا رہا ہے

میں بھی کھڑا کنارے سب کچھ یہ دیکھتا ہوں

منظر ہے دیدنی پر، مجھ کو رُلا رہا ہے

وہ یاد آرہا ہے،،،،،،،،

اُس دن بھی تھا یہ منظر،

جب ساتھ تھا وہ میرے

ڈل کے کنارے ہم بھی اِک بھیڑ میں کھڑے تھے

وہ بھیڑ دیکھ کر کے ہانجی یہ سوچتے تھے

سیزن جو اس طرح کا لگ جائے اِک خُدایا۔۔۔!
پھر سے سبھی کے گھر میں جلنے لگیں گے چُولہے
پسرِان سب کے کھانا کھائیں گے پیٹ بھر کے
دارومدار اُن کا تھا بھیڑ پر مُنحصر
جس پر کسی نے پھینکا گرینیڈ دور سے ہی
پھٹتے ہی بھیڑ میں پھر، یہ ڈل لرز اُٹھا تھا
چیخ و پُکار گونجی، اِک کھلبلی مچی تھی
لت پت لہو میں لاشیں اس جا تڑپ رہی تھیں
اُس کا جو ہاتھ میں نے تھاما ہوا تھا اُس دم
اب بھی تھا ہاتھ میں پر، باقی جسم نہیں تھا
وہ دردناک منظر آنکھوں میں میری اب تک
ایسے ٹھہر گیا ہے،،،،،،
جیسے کہ ہاری پربت صدیاں گزرنے پر بھی
اپنی جگہ کھڑا ہے
سب کچھ وہ دیکھتا ہے

چاند آنگن کا مکیں

سلوٹیں بستر کی تن سے
اس طرح لپٹیں کہ پھر
رہگذر یادوں کی
میرے سامنے تھی اور میں
نوکِ مژگاں پر سجے تاروں کا منظر دیکھ کر
چاند کو مُٹھی میں لینے کے لئے مچل اُٹھا
خوشبوؤں کا کارواں بھی
ساتھ میرے ہولیا
کہکشاں کے درمیان
کتنا حسیں لگتا تھا وہ

میں نے ہاتھوں کو بڑھایا

چاند کی جانب تبھی

ایک موذن کی اذاں سے

ہو گیا بیدار میں

میں نے سوچا؟

خواب جھوٹا فجر کا ہوتا نہیں

ایک دن تو چاند ہو گا

میرے آنگن کا مکیں

جو تھی تنہا آج تک

وہ زندگی ہو گی حسیں

یلغار

یہ کاغذ کے لشکر تو ضد کر رہے ہیں

کے یلغار دھرتی پہ ہو کر رہی گی

عدُو اس طرح پھر کھڑا ہو گیا ہے

کے پورس کے ہاتھی مقابل ہوں جیسے

ہیں، گھوڑے سکندر کے حیران لیکن

زمانہ! کی ندا ہے جو آگے بڑھے گا

جو شطرنج میں شہہ مات دے گا وہی اک

یہاں جیت پائے گا بازی وہ یکسر

زمیں سوچتی ہے یہ یلغار کیسی؟

نہ شمشیر بھالے نہ سالار کوئی

نہ ٹاپوں کی آواز ہی آرہی ہے

نہ چیخیں ہیں اُٹھتی، نہ خیمے ہیں جلتے

نہ گھن گرج کوئی نہ توپیں ہیں چلتی

لڑیں گے تو یہ لوگ کیسے لڑیں گے

کہ گھیرا ہے کو ذمہ داریوں نے

ہیں محتاج روٹی کے ٹکڑ وں کے سارے

رگوں میں تو ان سب کے پانی بھرا ہے

لہو کی جگہ اب تو آنسو بہیں گے

لبوں کی میرے پیاس اب نہ بجھے گی

میں پیاسی تھی برسوں کی پیاسی رہوں گی

میرے پیاسے ہونٹوں پہ بس یہ دُعا ہے

جو ٹالی خُدا نے ہے یلغار اب کے

کہ ٹل جائے ہر ایک یلغار یونہی

کہ ٹل جائے ہر ایک یلغار یُونہی

قُربتوں کا تصور

جانے کیوں لگتا ہے، مجھ کو یہ موسم
دردِ جُدائی کی دے کے سوغات مجھے
ہو جائے گا رُخصت تنہا چھوڑ کے تو
دیوداروں کے بیچ سے چھن کر چاندنی
رفتہ رفتہ جھیل کے اندر اُترے گی
ہر جانب سے پھر کچھ بے بس پرچھائیاں
کانچ کے ٹکڑوں پر بھی رقص کریں گی اور
چاروں جانب جنگل کی وحشی سرسر
شب کو اپنے پیاسے ہونٹوں سے چُھوکر
اُس کے مخملی وجُود کو گھائل کرتی جائے گی
دُور دُور تک پھیلا کر اپنا دامن

سُلگا دے گی گہرے پانی کو جس سے
لمحہ لمحہ ہر سُو ایک بکھرتی دُھند
ساری کائنات کو لے کر جھولی میں
سمٹ جائے گی ساگر کی گہری تہہ میں
ایسے وقت میں تیری قربتوں کا تصور
مجھ کو بھی چھپا لے گا آغوش میں
اور تصوّر ہی باقی رہ جائے گا

تصویر کا دُوسرا رُخ

دے رہے تھے ایک دوُجے کو
مُبارک لوگ آج
جشنِ آزادی کی ہر سوُ دھوم تھی
جھُومتا، لہرا رہا تھا وہ ترنگا شان سے
ہو رہی تھی پھر نمایاں
اُس سے عظمت ہند کی
چار سُو لوگوں کا تھا اژدہام بھی
پاس تھا اک ناتواں بُوڑھا کھڑا
گود میں اُس کے تھی بچّی پھُول سی
برہنہ تھا جسم سر سے پاؤں تک
پھر بھی شامل ہو گیا تقریب میں
دھُوپ سے جھلسا تھا بچّی کا بدن

تڑپتی چلا رہی تھی بُھوک سے
اور بُوڑھے کی نظر تھی
اُس ترِنگے پر جمی
جو ہوا میں جھُومتا تھا بے خبر
مُفلسوں کی آرزو سمجھے بغیر
بُوڑھی آنکھوں میں یہ حسرت تھی کے کاش
ہو میسر اتنا کپڑا ہی اُسے
جس سے بچّی کا بدن وہ ڈھک سکے
پھر تو وہ بھی فخر سے سب کو کہے
در حقیقت آج میں آزاد ہوں
در حقیقت آج میں آزاد ہوں

سوُرج کا اعلان

اُفق پر اُگ رہا سوُرج

یہی اعلان کرتا ہے

اندھیروں کے مُسافر

باندھ لیں رختِ سفر اپنا

اندھیرے کی پرت کو

کاٹ ڈالیں اپنی ہمت سے

اڑیں آندھی کا دامن تھام کر

افلاک کی جانب

تبھی مغرور سوُرج

آپ سے پوُچھے گا یہ آکر

اندھیری بستیوں میں

رہنے والوں
ہم کو بتلاؤ
تمہاری نسل کو کتنا
اُجالا چاہیے بولو؟
تمہارا حق اُجالوں پر ہے
میں تسلیم کرتا ہو ں
اُجالا اپنے حصے کا
تمہیں میں آج دیتا ہوں
اُجالا اپنے حصے کا
تمہیں میں آج دیتا ہوں

چیخ 1

ایک مُدت ہوگئی

رہتے ہوئے اِس شہر میں

لوگ ہیں

گونگے جہاں کے

اور بہرے راستے

ایسی صورت میں بھلا

کیسے کوئی سُن پائے گا

بے صدا لمحوں کا غوغا

بے صدا لمحوں کی چیخ

2

میری آنکھوں نے

جو دیکھے تھے فساد

اُس کے منظر

آج بھی موجود ہیں

اور آج بھی کانوں میں میرے

گونجتی ہے دفعتاً

بے صدا لمحوں کی چیخ

بے صدا لمحوں کی چیخ

چھوٹے چھوٹے ذہن کے لوگ

کچھ دیوانے کرنوں کو
مُٹھی میں لے کر سمجھ رہے ہیں
ہم نے سُورج قید کیا ہے
اور اُجالوں پر اب ہوگا راج ہمارا
وہ تو ہیں نادان بیچارے
اُن کو یہ معلوم نہیں کہ
سورج کا معمُول ہے اپنا
جب چاہے گا نکلے گا
اور چھپ جائے گا
اس لیئے میں کہتا ہوں اے
چھوٹے چھوٹے ذہن کے لوگو
تم ضد چھوڑو، میری مانو

پہچانو اوقات کو اپنی
فوراً اپنی مُٹھی کھول کے
کرِنوں کو آزاد کرو تُم
ورنہ سُورج کے اس غیظ سے
ہاتھ تمہارے جل جائیں گے
خُون رگوں میں جم جائے گا
ہڈیاں سُرما بن جائیں گی
ہوش میں آؤ، یہ تو سوچو
کِس کے آگے جا کر پھر تُم
ان ہاتھوں کو پھیلاؤ گے
خُود ہی اک دِن پچھتاؤ گے
خُود ہی اک دِن پچھتاؤ گے

سوداگر

بھاری بھرکم بوٹوں کے سنگ
کانپنے لگتی ہے جب دھرتی
دَڑ دَڑ کی آواز کو سُن کر
بچے تو سہمے جاتے ہیں
مائیں بولیں اب کیا ہوگا۔۔۔؟
بہنوں کے دل دُھک دُھک کرتے
بوڑھے تھر تھر کانپنے لگتے
بیٹے کُود کے دیواروں سے
آگے پیچھے چھپ جاتے ہیں
یہ بھاگا۔۔وہ بھاگا دیکھو
پکڑو پکڑو۔۔۔مارو مارو
آوازیں ہر سو آتی ہیں
ٹک ٹک۔ٹھا ٹھا گولی چلتی

دونوں جانب سے کچھ لاشیں
دھرتی پر اوندھے مُنہ گر کر
خُونِ ناحق سے دھرتی کو
لال سُرخ کر جاتی ہیں ۔۔ پھر؟
گن پوڈر سے آگ کی لپٹیں،
ظُلم کا دھُواں چھا جاتا ہے
ماتم کرتے رات گذرتی
پو پھوٹے تو آنگن آنگن
سرکاری سوداگر آ کر
اک اک لاکھ کا وعدہ کر کے
لاشوں کا سودا کرتے ہے
یہ تو اُن کا کام ہے لیکن۔؟
ہم بھی ہاتھوں میں چیک لے کر
سوداگر بن جاتے ہیں

کھڑکیاں

پہلے ایک ہی گھر تھا میرا
اُس میں ایک ہی کھڑکی تھی
اور تھا ایک ہی دروازہ
جس میں رہ کر،
میں جذبات واحساسات کو
تنہا کرتا تھا محسوس،
اب بھی ایک ہی گھر ہے میرا
اور ہے ایک ہی دروازہ
لیکن اِک تبدیلی آئی وقت کے ساتھ
ایک دم سے کھڑکیوں میں ہوا اضافہ،

جن کے ذریعے،

نئے دور کی نئی آوازیں

چیخوں اور آہوں کی صُورت

اِس زہریلی ہوا کے ساتھ

میرے گھر میں داخل ہوکر

میرے کانوں کے پردوں پر

ہر دم دستک دیتی ہیں اور

جذبات واحساس کو میرے

دُور فضاؤں میں لے جاکر

دُھویں اور کہرے کی مانند

ہر سُو بکھیر دیتی ہیں

جس سے،،،، بہرے، اندھے، گونگے اور مکیں

میرے ہر اِک پوشیدہ

راز سے واقف ہو جاتے ہیں

حوصلہ

اتھاہ اک سمندر کی

مُنہ زور موجیں

عزم کے سفینے سے ٹکرا کے ہر پل

اُسے جنگ کا حوصلہ دے رہی ہیں

نہ ہی پاس اُس کے ہیں

پورس کے ہاتھی ، ایوبیؒ کا لشکر ،

سکندر کے ساتھی

نہ ہی لیس ہے وہ کسی اسلحہ سے

مگر پاس اُس کے عزائم کی فصلیں

نظر میں ہے منزل ، اِرادہ اٹل ہے

انہی کے سہارے تو وہ لڑتے لڑتے

سمندر کے طوفاں سے ٹکرا کے اک دن

کرے گا فصلیوں کو وہ ریزہ ریزہ

تلاطم کو دے کر کے ہمت سے پستی

ندامت سے لہریں بکھر جائیں گی اور

سمندر کی موجوں کو یاد آئے گا تب

کہ آیا تھا پہلے بھی سندھباد لیکن

یہ وہ تو نہیں ہے

مگر پر بھی ہمت اُسی کی طرح ہے

مگر پر بھی ہمت اُسی کی طرح ہے

نسلِ آدم کا وجود

لیے چلا ہے زندگی کا سفر
پھر ایک بار اُسی سمت مجھے
جدھر جانے سے میں کترا رہا تھا
جہاں دیکھا تھا بہتا خون میں نے.......!
جہاں دیکھی تھیں بد بُودار لاشیں........!
جہاں دیکھی تھی راکھ بستیوں کی........!
لہُو ــــــ انسانیت کا تھا یقیناً
وہ لاشیں ــــــ آدمِ اولاد کی تھیں
مکاں ــــــ مظلُوم لوگوں کی پناہیں
مگر میں پھر وہیں پہنچا ہوں جا کر

جہاں سے کل چلا تھا چھوڑ کر سب
یہاں اب کیا رہا ہے دیکھنے کو؟
شہر کی سُرخ اور سُنسان سڑکیں
مکیں خاموش اور ویران گھر ہیں
یہ سب کچھ دیکھ کر میں سوچتا ہوں
چلو اچھا ہوا اب تک ہوا جو!
نہیں تو شہر کی کمزور دھرتی
ظلم اور کب تلک برداشت کرتی
زخم اور کس طرح سہتی وہ خود پر
اُٹھاتی کب تلک گناہ سب کے
گلا انساں کا انِساں سے کٹا کر
یہ دھرتی خُون پی کر راکھ کھا کر
جگہ اپنی پہ قائم ہے یہ اب بھی
اگر غائب ہے تو بس نسلِ آدم

میرا کالم

سارے مُجھ سے پوچھ رہے ہیں
اخباروں میں تُم نے چھپنا
چھوڑ دیا کیا؟
یا پھر لکھنا چھوڑ دیا ہے
گر یہ بات نہیں تو کیا پھر
تیرے احساسات کی کھیتی
سُوکھ گئی ہے
لوگوں کی باتوں کو سُن کر
سوچ رہا ہوں
کِس کِس کو میں یہ بتلاؤں

اپنے دِل کا حال سُناؤں

میں تو آج بھی لکھتا ہوں پر

جس کالم میں میرا نام چھپا کرتا تھا

اُس کالم میں اب تو ہر دن

لاوارث لاشوں کے نام چھپا کرتے ہیں

لاوارث لاشوں کے نام چھپا کرتے ہیں

پتھر ہو جاؤں گا

یادوں کے موسم میں
جب بھی تیری یادیں
میرے دِل کے دروازے پر
دستک دے کر
مجھ کو یاد دلائیں گی
تُم نے ہم کو اپنے دِل کے
تہہ خانے میں قید کیا
فریادی لہجے میں
مجھ سے بولیں گی
خُدارا دروازہ کھول کے
ہم کو تم آزاد کرو اور

آہیں بن کر، شکویں بن کر
اپنے لب پر آجانے دو
پہلے اپنی آنکھیں موند کے
سوچوُں گا
پھر اُٹھ کر اپنے ہاتھوں سے
مستقبل کا بھاری پتھرّ
دِل کے دروازے کے پیچھے
رکھ دوں گا اور
خود بھی پتھرّ ہو جاؤں گا

خواب ہمارے سُکڑ رہے ہیں

ذہنوں کے کینوس پر اب تک
خوف کی اک تہہ جمی ہوئی ہے
خُونی لمحے بادل بن کر
آسمان پر بھٹک رہے ہیں
اندھیاروں سے لڑتے لڑتے
نیندکی وادی جھُلس گئی ہے
شاید اِک دن
سُورج چمکے دُور اُفق پر......!
اِس دھرتی پر اِسی لئیے یہ
جنگل، صحرا، ساگر بن کر

اُمیدیں تو پھیل رہی ہیں
لیکن کس کو یہ بتلائیں
چاند کو چھُونے کی خواہش میں
بوجھل پلکیں ہو جانے سے
خواب ہمارے سُکڑ رہے ہیں
خواب ہمارے سُکڑ رہے ہیں

ویران منظر

میں یہ سوچتا ہوں کروں کیا بیاں؟
یہ بارُود کی بو، یہ نفرت کی آندھی،
کہ سڑکوں پہ تازہ لہو کے یہ دھبّے
یہ بیوہ کے آنسو، یتیموں کی آہیں،
یہ گولی کی ٹھاٹھا، بندوقوں کی بولی،
بموں کے دھماکوں سے ہے شہر لرزا،
یہ واقعات عصمت دری کے ہزاروں
یہ لاشوں پہ منڈلا رہے چیل کوئے
یہاں ہر سمت زندگی کی گھُٹن ہے۔
وہاں اُٹھ رہے ہیں مکانوں سے شعلے

فضا زہر آلود جس سے ہوئی ہے

جہاں تک بھی میری نظر اُٹھ رہی ہے تباہی، سناٹا،

لہو اور دھواں ہے کراہیں اور آہیں

الم، سسکیاں ہیں یہ سب دیکھ کر میں

یہی سوچتا ہوں۔۔۔۔؟

یہ اُجڑی فضائیں، یہ ویران منظر

جو آنکھوں سے اوجھل کبھی ہو گئے تھے

کہاں سے چلے آئے پھر اِس شہر میں

کدھر سے چلے آئے میرے شہر میں

عجب ہے یہ منظر عجب داستاں ہے

مگر پھر بھی میری قلم سے بیاں ہے۔

تم مت آنا

بے بس، سہمی، زخمی دھرتی

زندانوں کا بوجھ اُٹھائے

آنسو پی کر، خون سے لت پت
کرب کی زنجیروں میں جکڑی

اپنی رہائی کی خاطر وہ

نہ جانے کتنے برسوں سے

اپنے پردیسی بیٹوں کو
چیخ چیخ کر بُلا رہی ہے
لیکن وہ تو خوف کے مارے

جانے کب کے بھاگ چُکے ہیں

ماں، بہنوں کی چیخیں سُن کر

کرب زدہ لمحات کے منظر

آگ، خون کی دیکھ کے سُرخی

وادی کے اخباروں میں

بے قابو سے ہو جاتے ہیں

لیکن زندانوں میں بیٹھے

اُن کے ہی کچھ اپنے بھائی

اُن سے کہتے ہے مت آنا۔۔۔۔!

ہم تو قسطوں میں مرتے ہیں

پر تُم اپنی جان بچانا ہم کو تو ہمسائے

دفنا دیں گے لیکن۔۔۔۔؟

تم مت آنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

ننّھا سُورج

گُمنامی کے خول میں اب تک
جتنی رُوحیں قید ہوئی ہیں
اُن رُوحوں پر،
خوف مُسلط ہے رُوحوں کا
جذبوں پر بھی پہرہ جن کا
بڑھتا جائے لمحہ لمحہ
اُمیدوں کے سُوکھے ساگر
کروٹ لینے سے قاصِر ہیں
اور بُوڑھی ہڈیوں کے پنجر
کمسِن لاشیں ڈھوتے ڈھوتے

ارمانوں کا بوجھ اُٹھائے

صلیبوں پر لٹک رہے ہیں

اور کبھی وہ اُٹھا اُٹھا کے سر کو اپنے

فولادی ہمت کے اُونچے

کوہساروں کو دیکھ رہے ہیں

اُن کی آنکھوں کے دیپک میں

آس ہے اب بھی

نہ جانے کیوں اُنھیں یقیں ہے

اندھیاروں سے لڑتے لڑتے

اُن ہی کوہساروں کے پیچھے سے اُبھرے گا

ننّھا سُورج

اور گمنامی کے اندھیارے مِٹ جائیں گے

اور گمنامی کے اندھیارے مِٹ جائیں گے

(مرحومہ آسیہ جیلانی کی نذر)

کون ہے قاتل مِرا؟

ظُلم و بیداد کا روح فرساں سلسلہ
خُون، لاشیں، دُھواں، اور جلتے مکاں
شہر کا شہر سہما ہوا خوف سے
بے کسوں کی کراہیں وہ سُنتی رہی
بھیگی پلکوں سے دیکھے جنازے کئی
چھین لی جب لعینوں نے کوئی رِدا
بچپنا خُون میں تر بہ تر ہو گیا
جبر دیکھا تھا اُس نے نِصف زندگی
جب ہوئی وہ جواں اُس نے کھائی قسم
قوم کا حق ادا کر کے لے گی وہ دم
اس لئے وہ صحافت ہی پڑھنے لگی
قوم کی غمگسار اور ہمدرد تھی

جذبہ انسانیت اُس کی رگ رگ میں تھا

بے زبانوں کی پھر وہ زبان بن گئی

وہ قلم سے یزیدوں کے کرتوت کو

جا بجا طشت از بام کرتی رہی

ایک خاتون کا حوصلہ دیکھئیے

بن گئی ''رشل کوری'' وہ کشمیر کی

دردِ ملت کا دل میں بسائے ہوئے

خدمتِ خلق کو گھر سے نکلی تھی وہ

لیکن اُس کو دغا دے گئی زندگی

خُون کی آخری بوند تک کر گئی

اپنی ارضِ وطن پہ نچھاور یہیں

موت اُس کی ہے اب تک معمّہ بنی

رُوح اُس کی ہر گھڑی

چیخ کر بس یہی

پُوچھتی ہے سبھی سے بتاؤ مجھے

میری ہی موت پر خامشی کیا وجہ؟

شہر کے سارے اخبار خاموش کیوں؟
کیوں ہے اہلِ سیاست نے چُپ سادھ لی؟
نہ کسی سے میری دُشمنی تھی یہاں!
نا سروکار مجھ کو سیاست سے تھا!
حاکمِ وقت مجھ بتائیے ذرا؟
کِن خطاؤں کی پائی ہے میں نے سزا؟
میری راہوں میں جس نے اجل بیچ دی
ہاتھ کس کے تھے پردے کے پیچھے نہاں؟
کس کے ہاتھوں پہ ڈھونڈوں
میں خوں کے نشاں؟
پہن رکھے ہیں دستانے سب نے یہاں
جن کے الفاظ کو میں نے بخشی زباں
مار سکتے نہیں مجھکو ہرگز وہ۔ پھر؟
آخرش کون ہے میرا قاتل یہاں؟
آخرش کون ہے میرا قاتل یہاں؟

عہد

کُچھ دیوانے، کُچھ جذباتی

ہاتھو پر لے کر انگارے

خوابوں کی سُندر وادی کو

آگ لگانے نِکل پڑے ہیں

اُن کو یہ معلوم نہیں کہ

اُونچے اُونچے

ان بر فیلے کوہساروں نے

وادی سے یہ عہد کیا ہے

کہ وہ اپنے

میٹھے پانی کے جھرنوں سے

ہر اِک آگ بُجھا ڈالیں گے

احتساب

آج سارے ہیں مگن، اہلِ وطن
جشنِ آزادی کی تقریبات میں
ہیں مسرت اس لیئے کہ
ہم نے آزادی کے پچاس سال پورے کر لیئے
پر۔۔۔آج بھی ہیں نامکمل خواب وہ
جو کبھی تیرے میرے اجداد نے
سرزمینِ ہند پر دیکھے تھے ہم سب کے لیئے
فِکر کا لمحہ ہے یہ اہل وطن کے واسطے
دیش میں ہر بسنے والے مرد و زن کے واسطے
غور کر کے دیکھ لیں اِس پر سبھی۔۔۔۔!
کیا ہے پایا ہم نے اب تک؟

اور ہے کھویا تو کیا ؟

اِک طرف ہیں جشنِ آزادی کی خُوشیاں دُھوم ہے

دوسری جانب تڑپتی برتنوں میں بُھوک ہے

اِک طرف مزدُور کپڑے بُن رہے ہیں مِل میں اور

دوسری جانب جُھلستی دُھوپ میں ننگے بدن

اِک طرف ہیں بج رہے قومی ترانے دیش میں

دوسری جانب ہیں آہیں اور کراہیں، سِسکیاں

اِک طرف مہنگائی بڑھتی جارہی ہے دن بدن

دوسری جانب حوالے ہیں گھوٹالے اور ہم

اِک طرف ہے بٹ رہا کھانا اسکولوں میں مگر

دوسری جانب ہیں بُھوکے مر رہے لاکھو بشر

اِک طرف ہیں آسماں کو چُھو رہی عمارتیں

دوسری جانب غریبوں کو مسیر چھت نہیں

اِک طرف غُربا کی حالت بد سے بدتر ہو گئی
دُوسری جانب امیروں کی تجوری بھر گئی
اِس سے بڑھ کر المیہ اِس دیش کا ہو گا تو کیا؟
ایک راہبر کھا گیا چارہ بھی حیوانات کا
دُوسرا ہے یُوریا کے کیس میں اُلجھا ہوا
ایک کے گھر سے رُوپوں کی بوریاں ملتی ہیں اور
دوسرے کے گھر میں سونے کے پلنگ دیکھے گئے
کیا ہوا اِن رہبرانِ قوم کو سوچو ذرا؟
جو محافظ تھے لُٹیرے بن گئے ہیں قوم کے
آج بھی انسانیت دم توڑتی ہے ہر گھڑی
آج بھی نفرت کی کالی دُھند ہے چھائی ہوئی
آج بھی فرقہ پرستی سر اُٹھائے ہے کھڑی
آج بھی مذہب کا اژدہا ہے کھڑا ہر موڑ پر

جو کبھی مندر کو کھا جاتا ہے مسجد کو کبھی
آؤ اِن عصری مسائل کی طرف بھی دھیان دیں
نصِف صدی ہوگئی ہے ہم کو آزادی ملے
آج تک ہم کیوں نہیں کر پائے اِس کا سدِ باب
کل اگر پُوچھیں تو کیا دیں گے شہیدوں کو جواب
سر اُٹھائے ہیں کھڑے لاکھوں سوال اب سامنے
ہم کو لاحق ہے فکر اس بات کی سوچو ذرا؟
کب مِلے گی دیش کو پھر اِن گھوٹالو سے نجات
لوُٹنا چھوڑیں گے راہبر قوم کے کب دیش کو؟
کب مِلے کپڑا یہاں پر برہنہ اجسام کو؟
کب مرے گا دیش میں فرقہ پرستی کا یہ ناگ؟
کب چھٹے گی دُھند نفرت کی ہمارے دیش سے؟
کب کُچل پائیں گے ہم مذہب کے اژدے کا یہ سر؟

کب تحفظ مندر و مسجد کا کر پائیں گے ہم؟
کب سے ہوگی دیش کے فُٹ پاتھوں کو چھت نصیب؟
کب بدل پائیں گی نغموں میں یہ آہیں، سِسکیاں
کب سُنائی دیں گے ہم کو ہر طرف اُلفت کے گیت؟
کب مِلیں گے دیش میں رُوٹھے ہوئے ماضی کے میت؟
ہر حکومت ہی یہ دعوے کر رہی ایک دن
ہم غریبوں کو غریبی کی سطح سے لائیں گے اوپر مگر؟؟؟؟
غیر ممکن ہے یہ وعدے ہوں وفا حُکام کے
پُوچھتے ہیں آج ہم ارباب اقتدار سے
سب کو اپنا حق دلانے کے لیئے
کیا اِک صدی لگ جائے گی ؟
گر یہی اِس دیش کی حالت رہی
تو یقیناً اِک صدی لگ جائے گی

سات سوال

تم ہو ایک ماہر نفسیات

اور میں ٹھہرا ایک ذہنی مریض

چند سوال کروں میں تم سے

دو گے تم مجھے جواب؟

تو بتلاؤ۔۔۔۔''

ساحل پر کیوں ڈوبتی ہیں کشتیاں؟

ماں کی گود میں سوئے بچّے ڈرتے کیوں؟

جن رُوحوں نے آسمان کو اُٹھا رکھا ہے

صدیوں سے اپنے سر پر،

انہیں نصیب کیوں سائبان نہیں؟

گھنا چنار جو دیتا ہے چھاؤں اوروں کو

اُس کی شاخوں پر سُورج کیوں رحم نہیں کرتا؟

دو بھائی جائیداد کے جھگڑے میں اکثر

غیر کے لشکر سے کیوں مانگتے ہیں امداد؟

ننّھے پنچھی جان بُوجھ کر، دیکھ کے دانہ،

آنگن میں کیوں اُترے ہیں؟

جبکہ ہے معلوم اُنہیں کہ

اُن کی تاک میں بیٹھا ہے کوئی صیاد؟

پستہ قد لوگوں کے نام بڑے کیوں ہوتے ہیں؟

کیا اِن سات سوالوں کے

بن پائیں گے تم سے سات جواب

اگلی بار مِلو جب مجھ سے

سوچ کے رکھنا سات جواب

یاد رہے تم ہو ایک ماہر نفسیات

ہائیکوز

کر حوصلہ عطا
کرتا ہوں تیرے نام سے
آغاز یا خُدا



اُس ذی وقار سے
گر ہو سکے تو مانگ لو
پروردگار سے



میرے پاک رسولؐ
دُعا امن کی مانگی ہے
کرنا سے اسے قبول

میرے پاک رسولؐ

آپؐ عرش کے تارے ہم

آپؐ کے راہ کی دُھول



صدا دیتی ہے

کہ میری ماں مجھے ہر وقت

دُعا دیتی ہے



سمجھاتی ہے مُنیا

سمٹی ہے مُٹھی میں اُبو

انٹرنیٹ سے دُنیا

کانپے رُواں رُواں
دیکھ کے اس شہر سے
اُٹھتا ہوا دُھواں



مشکل ہو گیا جینا
جب بھی دیکھی گاؤں کی
الھڑ شوخ حسینہ



سحر کر دے
میرا طویل سفر جلدی
مختصر کر دے

تھر تھر کانپے کھاٹ
بھاری بوٹوں کی آہٹ سے
ہو گئی نیند اُچاٹ



انساں بدل گیا
دشتِ نظر میں درد کا
عنواں بدل گیا



تم تو عظیم ہو
کیسے بتاؤں دل میں تم
کب سے مُقیم ہو

کرتا ہے بے حال
خُونِ ناحق سے آدم
دھرتی کو ہر سال



اس نگری میں آ
دل کے ویرانے میں تُو
دِیپک ایک جلا



ہے کوئی ہوشیار
کچھ کہہ رہے ہیں سُن لو
جلتے ہوئے چنار

بے قابو ہیں سانسیں
اُس کا رستہ دیکھ رہی ہیں
جانے کب سے آنکھیں



چنچل سی اِک لڑکی
جس کے چھُو جانے سے تن میں
اِک چنگاری بھڑکی



کاٹ کے اپنے پاؤں
ڈھُونڈھ رہا ہے آدم آج
تپتی دُھوپ میں چھاؤں

ہم کو ڈستا ہے

ہجر کے موسم میں جب یہ

مینہ برستا ہے



پانی کے دھارے میں

وادی کا حُسن ہے رقصاں

اِس ایک شکارے میں



ہمسائے چلے گئے

چھتنار تو ہیں قائم

سائے چلے گئے

پیغام بھیج دے
یادوں سے مہکتی ہوئی
اک شام بھیج دے



بدلے گی تقدیر
ایک نہ اک دن ٹوٹے گی
ظُلمت کی زنجیر



ناطہ ٹوٹ گیا
جس میں گزُرا تھا بچپن
گاؤں چھُوٹ گیا

دیوار دیکھ کر
کچھ یاد آ گیا ہمیں
اخبار دیکھ کر



سب کو بتایئے
گر ہو سکے جہان سے
نفرت مٹایئے



تکرار کس لیئے
اُلفت سے بات کیجئے
یلغار کس لیئے

شاید راس آئے

اپنے خوُن سے آدم آج

اپنی پیاس بجُھائے



ڈر سلامت ہے

گُم مکیں ہیں شہر میں

گھر سلامت ہے



بھیگے گلاب نے

شاعر بنادیا مجُھے

تیرے شباب نے

ضیا مانگوں گا

تیری راہوں میں اُجالوں کی

دعا مانگوں گا



ابدی اصول سے

نسبت ہے آج بھی مجھے

اپنے رسولؐ سے



کیسا تو مُسلمان

جاتے ہوئے مسجد کو

نکلتی ہے تیری جان

دیدہ ور کوئی
تھا نہ سفر میں ایک پل
ہم سفر کوئی



کہنے کو ہے یار
اکثر عقب سے ہی ہم پہ
وہ کرتا ہے وار



اس پہ کرنا غور
شور مچانے والا اکثر
خود ہوتا ہے چور

کھُل جائے گا بھید
جب رشتوں کے غُبارے میں
کر دو گے تم چھید



یہ کیسا دستور
جس کو جتنا چاہیں اتنا
ہو جائے وہ دُور



مشکل ہو آسان
اوپر والا جب بھی ہم پر
ہوگا مہربان

لاشوں کا بیوپار
کرتے کرتے بن بیٹھا
آج بڑا ازردار



شاید جائے ڈر
چاروں جانب دیکھ کے
پنچھی اپنے پر



دفتر، تھانہ، کورٹ
اب تو ہر دہلیز پر
بات کرے ہے نوٹ

ہو گا جب بٹوارہ
چاروں جانب بہہ جائے گی
تازہ خون کی دھارا



سو جا آنکھیں مُوند
جاگے گا چھت سے ٹپکے گی
جب پانی کی بُوند



لال سیاہی
پھانسی پہ چڑھا دے گی مجھے
تیری گواہی

تھوڑی زمین دے
ویران ہو گیا شہر
میرے مکین دے

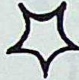


دعویٰ کیا نادان
یہ تو وقت بتائے گا
کتنا کون مہان



بُھول نہ ایسی کر
سُورج کے نزدیک نہ جا
جل جائیں گے پر

برگ چنار بن
بننا ہے اگر کچھ تجھے
غمگسار بن



احترام کر
اپنے بیاض کی وہ غزل
میرے نام کر



اے حُسنِ یار تو
اپنی گلی میں جانتا
ہے مجھے عدُو

حوصلے بُلند
شاہین بناتا ہے تبھی
گھونسلے بُلند



ہم کو تو ہے یقیں
کوئی مہاجر ایک دن
بن جائے گا مکیں



شام آ گئی
جس کا تھا انتظار لبِ
بام آ گئی

پیغام لکھ گیا
وہ اپنی ہتھیلی پہ میرا
نام لکھ گیا



غار میں رہوں؟
میں تو ہوا ہوں، کس طرح
حصار میں رہوں



پیکر بنا کے دیکھ
انجامِ خواب ریگ پر
گھر بنا کر دیکھ



بادل برس گئے
لیکن تمہاری دید کو
ہم تو ترس گئے



سجدہ بھی ادا کر
جل جائیں گے یہ کھیت تو
بارش کی دُعا کر



نادان بہت ہے
روشن نہ کر چراغ کو
طوفان بہت ہے

اِمکان بہت ہیں
اب تو ہمارے شہر میں
زِندان بہت ہیں



جُنون سوُرج کا
شفق پہ چھا گیا جیسے
خُون سوُرج کا



صلہ دے مجھ کو
اپنی مخمور نگاہوں سے
پلا دے مجھ کو

آتی ہے جب چٹھی
تڑپاتی ہے ہم کو اپنے
گاؤں کی وہ مٹی



آئے گی جب موت
آندھی کیا اِک پھونک سے
بُجھ جائے گی جوت



چُھو کے تُو مجھے
کر دے نہ اِس جہان میں
بے آبرو مجھے

(شعری مجموعہ)

چاند، لمس، گلاب

پرویز مانوس

نام کتاب	-----	چاند، لمس، گلاب
مصنف	-----	پرویز مانوس
صفحات	-----	۱۶۰
سن اشاعت	-----	جولائی ۲۰۰۸ء
قیمت	-----	۳۰۰ روپئے
کمپوزنگ	-----	جمیل خان
ترتیب	-----	درخشاں پرویز
سرورق	-----	نذیر احمد وانٹ
طباعت	-----	جے کے آفسٹ دہلی
تعداد	-----	ایک ہزار

ملنے کا پتہ: ۱۱۵ آزاد بستی ویسٹ نٹی پورہ سرینگر ۱۹۰۰۱۵

اس کتاب کی اشاعت میں ریاستی کلچرل اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون بھی شامل رہا ہے
جس کے لئے مصنف اکیڈمی کا بے حد شکر گذار ہے۔

مصنف



پرویز مانوس کو شعر کہتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا
لیکن ان کا کلام قومی سطح کے مختلف رسالوں میں دیکھا
تو حیرت ہوئی کہ مختصر سے تجربے کے باوصف انہوں نے اتنے
اچھے شعر کہے ہیں کہ ان کی ایک شناخت قائم کرنے کیلئے کافی ہیں
ایمانداری کی بات یہ کہ ان کے یہاں ایک سوچتے ہوئے ذہن کا ایک
چھلکتی ہوئی فکر، ایک تازہ دم مشاہدے اور زبان کی پختگی
کے امکانات پہلی ہی قرأت میں اپنا وجود منواتے ہیں
ان پر ان حالات اور سانحات کا اثر بہت گہرا
لگتا ہے۔ جو اس بدقسمت وادی پر پچھلے کئی برسوں سے
محیط ہے جسے دنیا جنت بے نظیر کہتی ہے
اس پر جو قیامتیں گزری ہیں وہ کسی بھی صاحب دل انسان
کے وجود کو مسمار کرنے کیلئے کافی ہیں۔ پرویز مانوس کے اشعار
میں جابجا یہ احساس ملتا ہے کہ وہ وہی حساس انسان ہیں جن کے
قلب پر اس وادی ماتم کدہ کے نوحوں کا ارتعاش رقم ہوا ہے
جسے انہوں نے شعری زبان دی ہے غزل کے اشعار میں، نظموں کے مصرعوں
میں اور ہائیکوز میں یہ درد ہمارے دکھائی دیتا ہے ان کی شاعری میں خیال کی
ندرت اور کرب کی دھیمی آنچ موجود ہے۔ اس گرد و پیش کے پس منظر میں
ان کے کلام کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے تو قاری ضرور محظوظ
ہوگا کیونکہ اس مجموعے میں چاند کا حسن، لمس کا احساس اور گلاب
کی مہک کا خوبصورت امتزاج ہے۔
مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ قاری کے دل اور ذہن کو اپنی جانب متوجہ
کرکے وہ مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا جس کا وہ مستحق ہے۔

حکیم منظور
۱۵ جولائی ۲۰۰۵ء
سرینگر

درخشاں پبلیکیشنز 115، آزاد بستی ویسٹ، نئی پورہ سرینگر 190015